© rasailojaraid.com

وحیِ الٰہی

إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ

(۲)

پس عام انسانوں تک کلام اللہ کے پہنچنے کا ذریعہ یہی دو بزرگترین ہستیاں تھیں، ایک جبرئیل
ین، اور دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید نے جب خود ان کی حقانیت، امانت، اور
یانتداری پر مہر تصدیق ثبت کردی تو اس کا مطلب بجز اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ ہم تک آنحضرت
لی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے قرآنِ مجید جس طرح پہنچا ہے وہ بعینہ ایک لفظ اور ایک حرف کے
یر و تبدل کے بغیر اللہ کا کلام، اور قلبِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اُسی کے نازل کیے ہوئے ارشادات ہیں۔

قرآن مجید کا ایک عام طریقہ خطاب یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ سے متعلق فلسفیانہ موشگافی نہیں کرتا۔ بلکہ
ئی حقیقت سمجھانی ہوتی ہے، تو اس کے لیے عام مشاہدات اور روزمرہ کے واضح تجربات کو بطور دلیل
ش کرتا ہے، تاکہ لوگوں کا استبعاد دور ہوجائے، اور وہ یہ سمجھ لیں کہ جب کسی قسم کی چیزیں دنیا میں بکثرت
جاتی ہیں تو اگر اُسی قسم کی اور کوئی چیز بھی موجود ہو تو اس میں حیرت و استعجاب کا کوئی موقع نہیں
۔ وحی کی نسبت بھی قرآن نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ جو لوگ اس کو مستبعد سمجھتے تھے کہ کس طرح
ئی فرشتہ آسمان سے اُتر کر ایک انسان کو خدا کا کلام سُنا سکتا ہے۔ اُن کی حیرت فرو کرنے کے لیے
یا گیا کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ آپ سے پہلے بھی انبیاء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسل پر وحی نازل ہوتی رہی ہے اور فرشتوں کے ذریعہ خدا کا کلام اُن تک پہنچتا رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد حق بنیاد ہے:-

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ.	آپ فرما دیجیے۔ میں رسولوں میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائیگا۔ میں صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی گئی ہے اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

غور کیجیے اس آیت میں کس طرح بڑے زور کے ساتھ اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت کوئی ایسی بات نہیں فرماتے جو دوسرے انبیار نے نہ کہی ہو۔ جس طرح اُن پر وحی آتی تھی، آپ پر بھی آتی ہے، اور جس طرح وہ وحی کے پابند تھے، آپ بھی پابند ہیں۔ اور جس طرح اُن کا کام محض تبلیغ پیام حق تھا آپ کا کام بھی یہی ہے اور اس سے متجاوز ہو کر امور تکوینیہ میں آپ کو کوئی دخل نہیں، ایک اور آیت میں اس کی تصریح اس طرح کی گئی ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ	آپ کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ اُن کو توبہ کی توفیق دے، یا عذاب دے وہ تو بہرحال ظالم ہیں۔

آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ خدا نے کفار سے جو وعید کی ہے اُس کی مدت کیا ہے؟

قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا.	آپ فرما دیجیے، میں نہیں جانتا کہ تم کو جس چیز سے ڈرایا گیا ہے وہ قریب ہے۔ یا میرا رب اُس کے لیے کوئی مدت مقرر کریگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر متعدد آیتوں میں یہ بتایا گیا کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہی ہیں۔ فرق یہ ہے

آپ پر وحی آتی ہے۔ مثلاً :-

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ آپ فرما دیجیے میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ البتہ مجھ پر وحی آتی ہے۔

وحی سے متعلق مشرکین اور اہل کتاب کا یہ فرق کہ اول الذکر وحی کے لفظ اور مفہوم سے ناآشنا ہیں

اور آخر الذکر اس سے پورے باخبر ہیں اپنے انبیا، پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اُن کے صحیفہائے رسالت کو کتب

سماوی مانتے ہیں۔ اس قدر واضح ہے کہ قرآن مجید نے اس کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ مثلاً

والذین اٰتینٰھم الکتٰب یعلمون اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ قرآنِ

انہ منزل من ربک بالحق۔ مجید حق کے ساتھ آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ حضور قرآن کی زبان سے جو اسرار و رموزِ حقیقت بیان فرماتے ہیں وہ

آپ کی قوتِ متخیلہ یا مفکرہ کی انتہائی بلند پروازی کا نتیجہ ہوں اور وحی نہ ہو۔ تو اس ایک احتمال سے

بھی قرآنِ مجید نے سکوت نہیں فرمایا، بلکہ متعدد طریقوں سے اس کی پُر زور تردید کی۔ ارشاد ہوتا ہے:-

وما علمنٰہ الشعر وما ینبغی ہم نے محمدؐ کو شعر نہیں سکھایا اور وہ آپ کے شایانِ شان

لہٗ ان ھو الا ذکر و قراٰن بھی نہیں۔ وہ تو محض نصیحت اور کھول کر بیان کرنے والا

مبین۔ قرآن ہے۔

پھر شعراء کی مذمت کر کے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور گمراہ لوگ اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ اس

حقیقت کو اور زیادہ راسخ کر دیا گیا اور فرمایا گیا کہ قرآن "سراپا نور" ہے "ہدایت و نصیحت" ہے "اور سینوں

کے لیے شفا" "اور حکمت سر بسر" ہے۔

صاف لفظوں میں اعلان ہے۔

الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ سب تعریفیں اُس خدا کے لیے ہیں جس نے اپنے بندہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الکتٰب ولم یجعل لہ عوجًا۔ — کتاب اُتاری اور اُس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔

قُرانًا عربیًا غیر ذی عوجٍ لعلّھم یتقون۔ — قرآنِ عربی جس میں کوئی کجی نہیں تاکہ وہ پرہیزگار ہو جائیں۔

لَا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیلٌ من حکیم حمید۔ — اس میں باطل نہ اُس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اُس کے پیچھے سے، حکمت والے اور قابل تعریف خدا کا اُتارا ہوا ہے۔

ھٰذا بصائرُ من ربکم وھدًی ورحمۃٌ لقومٍ یؤمنون۔ — یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہیں اون لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے ہیں۔

غور کیجیے کیا یہ تمام صفات اُس کلام کے لیے ہو سکتی ہیں جو کسی انسان کی فکر کا نتیجہ ہو۔ خواہ اس کے نفس قدسی کو عقل فعّال کے ساتھ کتنا ہی قریبی اتصال ہو۔ اور اُس کے شعور و احساس کی قوتِ پرواز کتنی ہی طائر سدرۃ المنتہیٰ سے برسرِ چشمک زنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو کلام ذاتی ہے اُس کے لیے بھی یہ صفات اس شان کے ساتھ کہیں نہیں بیان کی گئی ہیں۔

اِن آیتوں کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں جن میں قرآن مجید کو بہ صراحت اللہ کا کلام کہا گیا ہے مثلاً

وان احدٌ من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ — اور اگر کوئی مُشرک آپ سے امن طلب کرے تو آپ اُسے امن دید یجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے۔

جو لوگ قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے بلکہ اُسے کلامِ بشر کہتے ہیں اُن کی تکفیر کی گئی ہے ارشاد ہے

اِنّہ فکّر وقدّر فقتل کیف قدّر ثم قُتِل کیف قدّر ثم نظر ثم عبس وبسر ثم ادبر واستکبر — اُس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرالیا پس وہ قتل ہی کیا جائے اُس نے کیا دل میں ٹھانا تھا۔ پھر وہ مارا جائے اُس نے دل میں کیا طے کیا تھا، پھر اُس نے دیکھا اس کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقال ان هٰذا الا سحر یوثر ۔ تیوری چڑھائی اور منہ بسور لیا، پھر اس نے پشت پھیری اور تعلّی کرنے لگا۔

ان هٰذا الّا قول البشر ۔ پھر اس نے کہا یہ تو محض جادو ہی۔ یہ (قرآن) تو صرف بشر کا قول ہے۔

یہ سب آیتیں ولید بن مغیرہ سے متلق ہیں۔ اس کے یہ تمام کافرانہ اعمال واقوال بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

سَاُصْلِيهِ سَقَرَ ۔ میں عنقریب اس کو دوزخ میں داخل کرونگا۔

شبہ ہوسکتا تھا کہ حضور پر وحی کا نزول مسلّم! لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بغیر کسی ترمیم تنسیخ اور تغیر و تبدل کے ہم تک پہنچا ہے۔ آپ آخر بشر تھے۔ بھول چوک ہر انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، تو قرآن مجید نے اس سے بھی اغماض نہیں کیا۔ صاف طور پر فرمایا گیا۔

لا تحرك به لسانك لتعجل به آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے

ان علینا جمعه وقرآنه فاذا بیشک قرآن مجید کا آپکے سینہ میں جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہی

قرأنه فاتبع قرآنه، پس جب ہم آپ کو پڑھائیں تو آپ بھی اس کی اتباع کیجیے

کورچشمان باطن اگر آفتابِ حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے وحیِ الٰہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف لا تحرك به لسانك لتعجل به فرمانا ایک طرف، یہ مختصر سی آیت اس حقیقت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں۔ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لیے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُسے یاد رہ جائے اور اس کا کوئی حرف اور لفظ حاشیہ حافظہ سے محو نہ ہو جائے۔ یقینی بات ہے کہ حضور پر مبدأ فیاض کی طرف سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا۔ اور آپ بہ تقاضائے بشریت اُسے یاد کرنے کے لیے اپنی زبان اقدس کو حرکت دے رہے تھے۔ اس پر حضرتِ حق جل مجدہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ کا کلام کہا گیا ہے، وہ صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے، یا عربی الفاظ اور اُن کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی ہے آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ یہ معنیٰ و لفظ کی تفریق خاص عہد نبوت میں اُن لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسولِ صادق و امین کی تکذیب، انتہائی جسارت و بیباکی سے کرتے تھے۔ وہ خود اربابِ لسان تھے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیبِ بیان کی مہارت میں یگانۂ روزگار تھے۔ اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انہیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو مع اُس کے الفاظ و معانی کے ساحرانہ یا "کاہنانہ" یا "شاعرانہ" کلام کہتے تھے لیکن یہ کہنے کی ہمت انہیں بھی نہیں ہوئی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ میں ایسی کونسی "الوہی" خصوصیت ہے کہ وہ انہیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں۔ ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن علّام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلسف اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کرینگے اور دوسری طرف اپنے "تفلسف" کا بھرم قائم کرنے کے لیے وہ معانی و مطالب کے لحاظ سے قرآن کو وحی خداوندی تسلیم کرینگے اور اُس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہونگے۔ اس بنا پر قرآنِ مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اس کی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اُس کا نازل کیا ہوا ہے۔ ارشاد ہے۔

قرآناً عربیاً غیر ذی عوجٍ۔ قرآن عربی بغیر کسی کجی کے۔

اس کے علاوہ آیات ذیل غور سے پڑھیے۔

اِنّا انزلنٰہُ قرآناً عربیاً۔ ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے۔

انّا جعلنٰہُ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون۔ بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وکذٰلک انزلنٰہ قرآناً عربیاً۔ اور اسی طرح ہم نے اُس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔

وکذٰلک انزلنٰہ حکماً عربیاً۔ اور اسی طرح ہم نے اُس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔

دیکھیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہیئے تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے القاو ایحار کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح معانی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا، اسی طرح دل میں معانی کا خطور اور اُن کا تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی نسبت کس طرح ایک ایک بات کو کھول کھول کر مکرر سہ کرر بیان کیا ہے، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس میں رمز یہی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے۔ یہی مسئلہ دین کی بنیاد اور اساس ہے اس لیے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ آیات بالا پر غور کیا جائے تو حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) قرآنِ مجید اللہ کا کلام ہے، اور مع الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبرئیل اُسے لے کر نازل ہوئے ہیں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔

(۴) جبرئیل اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانتدار ہیں۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا کسی اور شخص نے اس کو بنایا نہیں ہے۔

(۶) شیاطین نے بھی اس کا القا نہیں کیا۔

علامہ ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ صفۃ الکلام میں اس پر بڑی عمدہ اور مفصل بحث کی ہے۔ اُس کے آخر میں بطور نتیجہ لکھتے ہیں۔ "پس معلوم ہو گیا کہ قرآن عربی اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ وہ نہ ہوا سے اُترا نہ لوح سے اور نہ کسی دوسرے جسم سے اور نہ جبرئیل اور نہ محمد سے، اور نہ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے" (مطبوعہ منیریہ ص ۳۸-۳۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۷) آپ رسول کریم تھے۔ قرآن جیسا نازل ہوتا تھا، آپ ویسا ہی لوگوں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

(۸) آپ شاعر، کاہن، یا ساحر کچھ نہیں تھے۔

(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطعہ کا بیان۔

(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات یا وساوس کا حتمی رد۔

(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہنچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اُس کے سچے رسول ہیں۔ اس لیے جو کلام آپ کی وساطت سے پہنچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اُسے خدا کا کلام کہا ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ بے چون وچرا اُسے قبول کرلیں اور اُسے کلام اللہ یقین کریں۔

مندرجہ بالا نتائج قرآنِ مجید کی عبارات النص سے بالکل واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول برحق نہ مانے۔ اسی طرح کسی شخص کا ادعاءِ اسلام اُس وقت تک درست نہیں ہے جب تک کہ وہ مندرجۂ بالا تنقیحات پر ایمان واعتقاد نہ رکھے۔ جمہور اُمت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں اس پر اتفاق رہا ہے۔ اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اُسے مرتد قرار دے کر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "سلف اُن لوگوں کو جہمی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے، اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی کیونکہ جہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسماء و صفات کی بدعت جاری کی، اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اُس کی دعوت دی۔ جعد بن درہم نے بھی اسلام میں اس بدعت کو فروغ دینا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا، عین بقرعید کے دن اُسے ذبح کردیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے "لوگو! تم اپنی اپنی قربانیاں کرو، اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں جعد بن درہم کی قربانی کرتا ہوں، یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا، اور اُس نے حضرت موسیٰ سے کلام نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے[ل]"

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے، ہر مدعی اسلام کے لیے اس اعتقاد جازم کا رکھنا ضروری ہے۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود یہی ایک اعتقاد ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے۔ اگر کوئی شخص آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانۂ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہیے۔

کلامِ الٰہی کے اقسام و انواع اب آئیے اس موضوع پر ایک اور نقطۂ نظر سے بحث کریں۔ یعنی یہ معلوم کریں کہ خدا اپنے بندوں سے خود اپنے ارشاد کے مطابق کن کن طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ اور آیا اس باب میں عقلی اعتبار سے کوئی استبعاد ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے صاف ہو جانے کے بعد یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائیگی کہ قرآنِ مجید اللہ کا کلام ہے اور قرآن نے اُسے جس نوعیت و کیفیت کے ساتھ منزل من اللہ کہا ہے اُس میں کوئی عقلی یا فلسفیانہ استحالہ بالکل نہیں ہے۔

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کلام منجملہ صفات کمال کے ایک اہم صفت کمال ہے۔ اور خدا کی ذات (اگر وہ بعض "عقلاءِ یونان" کے وہم فاسد کے مطابق عقل اول کو پیدا کرنے کے بعد خود معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا ہے) تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے۔ پس جس طرح اُس میں علم، ارادہ مشیت، قدرت، خلق، اور فعالیت لما یرید کی صفات بدرجۂ اتم و کمال پائی جاتی ہیں ٹھیک اُسی طرح ضروری ہے کہ اُس میں صفت کلام بھی پائی جائے لیکن اس بات کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے

ل صفۃ الکلام ص ۳۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اللہ تعالیٰ کو ہم جن صفات کے ساتھ موصوف مانتے ہیں، انہیں ہم خود اپنی صفات پر قیاس نہیں کر سکتے مثلاً یوں سمجھیے کہ خدا کو رحمٰن اور قہار کہا جاتا ہے اور وہ یقیناً ان صفات کے ساتھ موصوف ہے لیکن اس کا رحم اور قہر ہمارے رحم اور قہر کی مانند نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رحم اور قہر کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہے یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا، جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قہر ثمرہ ہوتا ہے ہمارے نفس کے ہیجان و ثوران کا، جو کسی ناگوار طبع چیز کے دیکھنے سے ہمارے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوت غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہر دونوں کی تعریف میں مبدا اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں۔ مبدا کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے، اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثیر۔ اور چونکہ خدا کی ذات انفعال سے منزہ ہے اس لیے اگر وہ رحمٰن یا قہار ہے اور یقیناً ہے تو صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبدا کے اعتبار سے نہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی اور واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ۔ اسی پر خدا کی دوسری صفات علم، ارادہ، مشیت اور قدرت کو قیاس کر لیجیے۔ اِن کمالات کا اطلاق جن معانی سے ممکنات پر ہوتا ہے، خدا پر نہیں ہو سکتا۔ علم ارباب منطق کی اصطلاح کے مطابق کسی شے کے حصول کا نام ہو یا زوال کا۔ بہر حال کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ اس اعتبار سے علیم نہیں ہے۔ ارباب منطق و فلسفہ نے علم باری سے متعلق عجیب و غریب موشگافیاں کی ہیں اور ذہانت و طباعی کی بطرق مختلفہ داد دی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ کوئی شق بھی اعتراض سے خالی نہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ تمام صفات کا تعلق ذات سے مانتے ہیں۔ اور اس بنا پر حدوث و قدم اور امکان و وجوب کی بحث چھڑتی ہے۔ تو کوئی انہیں عین ذات ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور کوئی غیر ذات۔ اور جب اس جگہ بھی پناہ نہیں ملتی تو لا عین ولا غیر کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا تعمق نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ کہنا بھی ایک مغالطہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقلی سے خالی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ ہر صفت دو طرح کی ہے، ایک صفت ذات، اور دوسری صفتِ فعل، صفت ذات کا تعلق خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ اور جس طرح انسانی صفات انسان کی ذات کے ساتھ بایں معنی قائم ہیں کہ وہ فطری صلاحیت و استعداد کے مطابق اُس کے نفس ناطقہ کی لازمی کیفیات و ملکات ہیں۔ اسی طرح خدا کی صفات اُس کی ذات کے ساتھ اس لیے قائم ہیں کہ خدا کا خدا ہونا اُن صفات کے وجود و وجوب کا طبعی اقتضاء ہے۔ پھر جس طرح انسان کا نفس ناطقہ مرکب نہیں بلکہ بسیط ہے۔ مادی نہیں بلکہ جوہر مجرد ہے، اور اُس کے ساتھ ملکات کے قیام کی صحیح حقیقت و نوعیت ہمیں معلوم نہیں۔ اسی طرح خدا کی صفاتِ ذاتی اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، لیکن اُس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے جواب میں لیس کمثلہ شئی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تک علم انسانی کی صحیح حقیقت تو دریافت ہو نہیں سکی اور ہم اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ نفس ناطقہ کو یہ سب کہتے ہیں کہ وہ مبدءِ ادراک ہے کلیات و جزئیات کے لیے عقل کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسان کا طغرائے امتیاز و شرف ہے۔ روح کو دنیا جانتی ہے کہ زندگی کا دارومدار اُس کے انتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے۔ نفس ناطقہ ہے کیا؟ عقل کسے کہتے ہیں؟ اور روح کی کیا حقیقت ہے؟ تو اس میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر آتے ہیں کہ اُن کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پس جب ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے۔ تو ہم خدا کی صفات کی نسبت یہ کیونکر بتا سکتے ہیں کہ اُن کا قیام اُس کی ذات کے ساتھ کس طرح ہے، اور حق تو یہ ہے کہ جب خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت ہی ہمیں معلوم نہیں کہ وہ قیاس و وہم اور ظن و تخمین سے ورا الورا ہے۔ تو پھر ہم اُس کی صفات کی نسبت کیا قیاس آرائی کر سکتے ہیں لیکن جس طرح خدا کا وجود یقینی ہے۔ اسی طرح عقل کہتی ہے کہ خدا میں تمام صفاتِ کمال بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

اب رہی صفتِ فعل تو اس سے مُراد یہ ہے کہ فعلی طور پر خدا کی جس صفت کا ظہور ہو گا وہ بھی صفت ذات کی طرح خدا کی طرف ہی منسوب ہوگی۔ مثلاً خدا کے لیے صفتِ خلق ایک تو مرتبہ ذات ہے جس کی وجہ سے وہ خالق کہلاتا ہے۔ یہ صفت اس معنی کے لحاظ سے اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ جیسے آفتاب کے ساتھ روشنی، پھول کے ساتھ رنگ و بو۔ آتش کے ساتھ حرارت اور پانی کے ساتھ برودت۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صفت ذات چونکہ ذات کے ساتھ قائم ہے اس لیے ذات کی طرح یہ بھی واجب ہوگی لیکن واجب لذاتہ نہیں۔ بلکہ واجب لغیرہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ واجب لغیرہ کے لیے حادث ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ قدیم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ حال تو صفتِ ذات کا ہے۔ صفت فعل اس طرح نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق چونکہ ہر قسم کے "مفعول" اور "معلول" سے ہوتا ہے اس لیے یہ حوادث سے بھی متعلق ہوتی ہے لیکن اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں پڑتا جو اس صفت کا مبدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسی لالٹین کا تصور کیجیے جو ہشت پہلو ہے یعنی اُس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے۔ اب دیکھیے، اس چراغ کے لیے ایک روشنی تو وہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ یہ روشنی مطلق ہے کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ باہر نظر آرہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی روشنی چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اور چیز نہیں ہوگی تب بھی یہ روشنی چراغ کے وجود کے ساتھ پائی جائیگی لیکن دوسری روشنی کے ظہور و قیام کا تعلق اُن شیشوں کے ساتھ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی ایک شیشہ کو، مثلاً سبز شیشہ کو وہاں سے ہٹا لیا جائے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چراغ کی سبز روشنی بھی باقی نہیں رہتی ہے۔ اور اگر اُس کی جگہ بالفرض سُرخ شیشہ لگا دیا جائے تو روشنی بھی سُرخ ہو جاتی ہے۔ اب غور کیجیے کیا یہ سُرخ اور سبز روشنی شیشوں کی طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منسوب ہوتی ہے؛ ہرگز نہیں، بلکہ چراغ کی ہی روشنی کہلاتی ہے۔ اور اس روشنی کے تغیر و تبدل سے زمان کے اعتبار سے چراغ کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی اگر یہ سبز روشنی دو بج کر ۲۰ منٹ پر ظاہر ہوتی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ چراغ کی ذات اور اُس کی مطلق روشنی کا وجود بھی دو بج کر بیس منٹ پر پایا گیا ہو۔ بلکہ وہ اس وقت سے پہلے سے موجود ہیں۔

پس عقلِ خام کار کو سمجھانے کے لیے خدا کی صفتِ کلام کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ اور یہ سمجھیے کہ خدا کی صفتِ کلام جو بمنزلہ صفتِ ذات ہے وہ چراغ کی مطلق روشنی کی طرح ہے۔ اور وہ ازلی ہے ابدی ہے، قائم بذاتِ خداوندی ہے۔ اب رہی صفتِ کلام جو صفتِ فعل کے مرتبہ میں ہے۔ اُس کا تعلق ہر اُس چیز سے ہو سکتا ہے جو غایتِ لطافتِ روح کے باعث اس آفتاب حقیقت کے پاس چراغ کے شیشوں کی طرح، آنے کا شرف حاصل کر سکے۔ جس طرح چراغ کی روشنی رنگین شیشوں کے رنگ کے لحاظ سے مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آفتاب حقیقت کی صفتِ کلام کا جلوۂ جاں فروز کبھی عبرانی زبان میں ہوا، اور کبھی زبور و انجیل کی زبان میں، اور پھر سب سے آخر میں عرب کا ایک آئینہ تمثال قلبِ مزکی و مصفیٰ اُس کے سامنے آیا تو اُس کا ظہور عربی زبان میں ہوا، اور وہ "قرآن" کہلا دیا۔ قرآن کے تمام عربی الفاظ بے شبہ حادث ہیں۔ خود عربی زبان حادث ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ کلامِ الٰہی ہیں۔ اگر شیشوں کے تغیر و تبدل اور اُن کے رنگ برنگ ہونے سے چراغ کی روشنی چراغ کی ذات کے ساتھ بھی قائم رہ سکتی ہے اور وہ مختلف رنگوں میں ظہور بھی کر سکتی ہے۔ تو پھر اس میں کیا استبعاد ہے کہ خدا کی صفتِ کلام ازلی ہو، ابدی ہو، اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہو اور اُس کے ساتھ ہی انسانوں کی مختلف بولیوں اور زبانوں میں اس کا ظہور بھی ہو فافهم و تدبر۔ کیا عجب بات ہے کہ خود قرآنِ مجید نے نورِ الٰہی کو اسی تمثیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اللّٰهُ نورُ السمٰوٰتِ والارض۔ مثل — اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نورہٖ کمشکوٰۃٍ فیہا مصباحٌ ط المصباح فی زجاجۃٍ ط الزجاجۃُ کانّہا کوکبٌ دُرّیٌ یُوقدُ مِنْ شجرۃٍ مُبٰرکۃٍ زیتونۃٍ لاشرقیۃٍ وّلا غربیۃٍ یکادُ زیتُہا یُضیءُ ولولم تمسسہُ نارٌ ط نورٌ علیٰ نورٍ ط یھدی اللہُ لِنورہ مَنْ یَّشاءُ ط ویضرِبُ اللہُ الامثالَ للناس ط واللہُ بکل شیءٍ علیمٍ

مثال اُس طاق کی سی ہے جس میں چراغ ہو، اور چراغ ایک شیشہ میں ہو، شیشہ ایسا چمکتا ہو جیسے کہ گویا وہ روشن ستارہ ہے۔ یہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے روشن کیا گیا ہو، اور اس درخت کی نسبت نہ مشرق کی طرف ہو اور نہ مغرب کی طرف۔ تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے اللہ نورٌ علیٰ نور ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اللہ یہ امثال لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا علیم ہے۔

عام طور پر لوگوں کو مغالطہ پیش آتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ذاتِ واجب الوجود لذاتہ کی طرف حوادث کا انتساب ہی نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اس کی صفت علم، خلق اور ارادہ وغیرہ کے تعلق سے کسی شے معلوم، مخلوق، اور مراد کی نسبت اُس کی طرف کر سکتے ہیں، تو چند حادث الفاظ کو اُس کی طرف کیوں منسوب نہیں کر سکتے جبکہ اُن کے ظہور کا مبدا خدا کی صفتِ کلام ذاتی کا تعلق ہو۔ علامہ ابن تیمیہ نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

”اگر مستلزم للحوادث ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول، معلول، اور مربوب کہلائے، تو ضروری ہے کہ وہ حادث ہو۔ اور اگر وہ واجب بنفسہ ہو، تو ضروری نہیں کہ (استلزام للحوادث کی وجہ سے) وہ خود ممکن ہو جائے۔ یہی قول ائمہ اہل الملل و اساطین الفلاسفہ کا ہے۔ اور یہی قول جمہور اہل حدیث کا ہے“ (صفۃ الکلام ص ۵۳)

پھر آگے چل کر ص۵۵ پر اُن لوگوں کی تردید نہایت بلیغ فقرہ سے کی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دث کا قیام نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں:۔

ثُمَّ قالت طائفۃ والرب لا یقوم به الحوادث فیکون الکلام مخلوقاً فی غیرہ فجعلوا الکلام مخلوقاً من المخلوقاتِ ولم یفرقوا بین قال وفعل.	ایک گروہ کہتا ہے کہ رب کے ساتھ حوادث کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر کلام اُس کے سوا کسی اور میں مخلوق ہے۔ ان لوگوں نے اللہ کے کلام کو بھی منجملہ مخلوقات ایک مخلوق بنا دیا۔ اور انھوں نے قَالَ اور فَعَلَ میں کوئی فرق نہیں کیا۔

غور کیجیے، امام عالیمقام نے کس بلیغ انداز میں صرف ایک فقرہ لکھ کر تمام گتھیوں کی گرہ کشائی کردی۔ امام ہمام کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہے کسی شے کا اتصاف بصفۃٍ، اور ایک ہے مطلقاً انتساب۔ اتصاف کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ خدا کسی مخلوق سے متصف نہیں ہو سکتا۔ لیکن مخلوق کا اُس کی طرف انتساب ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ پہلے یہ کلام کو مخلوق لیتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ چونکہ خدا کے ساتھ کسی مخلوق کا اتصاف نہیں ہو سکتا اس لیے لامحالہ کلام کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس نے کلام کسی میں پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ قَالَ اور فَعَلَ میں بڑا فرق ہے۔ کسی کے فعل سے جو چیز وقوع میں آتی ہے وہ مفعول کہلاتی ہے لیکن کسی قائل کے قول سے اُس کی جس صفتِ گویائی کا اظہار ہوتا ہے وہ اُس کی مفعول نہیں کہلاتی۔ اس بنا پر خدا کے لیے جو صفتِ کلام پائی جاتی ہے وہ غیر مخلوق ہے اور خدا اُس کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے، اور ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اُس نے الفاظ کے ساتھ تکلم کیا ہے۔ اُن کا حکم کیا ہوگا؟ تو اُس کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم باری تعالیٰ کی طرف الفاظ کی نسبت اتصاف کے مرتبہ میں نہیں کرتے۔ بلکہ یہ محض انتساب کے مرتبہ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتنا الاستاذ العلام مولانا سید محمد انور شاہ قدس سرہ سے میں نے بارہا سُنا ہے کہ کلام الٰہی کا معاملہ مشکل نہیں جتنا کہ خواہ مخواہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ تمام مغالطوں کی بنیاد کلام نفسی، اور کلام لفظی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا عدم فرق و امتیاز ہے۔ دونوں کا حکم الگ الگ اور جُدا جُدا ہے۔ ایک طرف جہمیہ نے کلام نفسی کو کلام لفظی پر قیاس کیا تو وہ سرے سے خدا کی صفتِ کلام کے ہی منکر ہو گئے اور دوسری جانب بعض لوگوں نے کلام لفظی کو کلام نفسی کا ہم مرتبہ قرار دیا تو انہیں قرآن کے عربی الفاظ کو بھی قدیم اور غیر مخلوق ماننا پڑا۔ اصل وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

خدا کی حمد میں انوری کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا پہلا شعر ہے۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ　　گوہرِ ہر سود درجیب زیاں انداختہ

اس قصیدہ میں خدا کے اوصاف اور عقلِ انسانی کی کوتاہ رسی سے متعلق ایک نہایت بلیغ شعر کہا ہے

نورِ حیرت در شبِ اندیشۂ اوصافِ تو　　بس ہمایوں مُرغِ عقل از آشیاں انداختہ

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جس کو گوناگوں عقلی کمالات کے حاصل کرنے کی استعداد کے باوجود وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً کا مخاطب بنایا گیا ہو وہ کس طرح اوصافِ الٰہی کی صحیح حقیقت معلوم کر لینے کا ادعا کر سکتا ہے اس بنا پر عقلی توجیہ و تاویل وہی درخور قبول ہو سکتی ہے جو وحیِ الٰہی کی منصوصات کے مطابق ہو۔ اس کے علاوہ تمام استدلالات اور توجیہات سراسر لغو اور گمراہ کن ہیں۔

سُبحٰنَکَ لا علم لنا الا ما علّمتنا انّکَ انت العلیم الحکیم۔

(باقی)

© rasailojaraid.com